© rasailojaraid.com

فریضۂ اقامتِ دین

(از جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی)

(۲)

اقامتِ دین کے امکان و عدمِ امکان کی بحث

عدم امکان کے قائلین اب اس گروہ کے خیالات کو لیجیے جو اس نصب العین —— اس واحد فریضۂ حیات کی بجا آوری سے اس لیے کترا رہا ہے اور دوسروں کو بھی کترا کر چلنے کا مشورہ دے رہا ہے کہ بحالت موجودہ اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں اور دین کی اقامت کے لیے براہ راست جد وجہد کرنا نہ صرف ضیاعِ وقت ہے بلکہ مفادِ ملی کے لیے تباہ کن بھی ہے، اس لیے عقل چاہتی ہے اور مصلحت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ فی الحال اس کا نام نہ لیا جائے اور اپنی ساری قوتیں کسی ایسے مورچہ پر صرف کردی جائیں جہاں سے ہم اپنے ماحول کے بدلتے ہوئے حالات پر اس حد تک اثر ڈال سکیں کہ آئندہ چل کر حالات ہماری اس جد وجہد کے لیے نسبتاً زیادہ سازگار ہو جائیں اور وہ دورِ سعید آجائے جس میں ہم بآسانی اپنے نصب العین کی طرف علانیہ مارچ کرسکیں۔

اس نظریہ پر غور کیجیے تو ذہن میں چند سوال پیدا ہوتے ہیں:-

(۱) کیا اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے براہ راست جد وجہد کرنے میں اس کی کامیابی کے امکان و عدم امکان کی بحث پیدا بھی ہو سکتی ہے؟

(۲) کیا دین کی اقامت واقعی ناممکن ہے؟

(۳) ناسازگاری حالات کی بنا پر اس منزل مقصود کی طرف پھیر کے راستوں سے پیش قدمی کرنے کی کوئی عملی مثال، کوئی انسانی تجربہ یا کوئی صحیح فکری بنیاد موجود ہے؟

انہی سوالوں کے صحیح جواب میں اس نظریہ کا سقم و صواب مستور ہے، اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبروں کے طریق کار اور اسوۂ اعمال سے یہ جوابات حاصل کیے جائیں۔ اللہ کی کتاب سے اس لیے کہ اسی نے اپنے پیروؤں پر یہ بار عظیم ڈالا ہے اور ساتھ ہی اس کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہے، اس لیے یہ ممکن نہیں کہ تمام معاملات میں تو اس نے ہماری رہنمائی کی ہو اور اس معاملے کو تاریکی میں چھوڑ دیا ہو جو پورے صحیفۂ زندگی کا سرعنوان اور تمام فرائض دینی کا صدر نشین ہے اور اللہ کے رسولوں کے طریق کار اور اسوۂ اعمال سے اس لیے کہ ان پاکان خاص اور ان کے سچے اور کامل پیروؤں کے سوا دنیا کسی ایسے انسان یا انسانی گروہ سے واقف نہیں ہے جس نے اس نصب العین کو اپنایا ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ادائے فرض بحث امکان سے بے نیاز ہے

قرآن مجید نے اس چیز کو کر اپنے منصب اور نصب العین کی خاطر جد و جہد بہر حال ضروری ہے اور اس میں انجام کی پروا کیے بغیر ہر وقت لگے رہنا چاہیے۔ اتنی وضاحت سے بیان کیا ہے اور انبیاء کرام نے اپنے عمل سے اس اصول زندگی کی ہمہ گیری اور صداقت کی ایسی روشن شہادتیں بہم پہنچائی ہیں کہ ایک منکر قرآن ہی اس کے انکار کی جرأت کر سکتا ہے۔ ہر نبی کو منصب رسالت پر مامور کرتے ہی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ لوگوں کے سامنے اس حقیقت اور اس مطالبہ کا اعلان کر دو کہ:-

اُعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ — لوگو اللہ کی بندگی کرو اور "طاغوت" کے اتباع سے بچو

....اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ — .... میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری ہی عبادت کرو۔

چنانچہ اسی اعلان سے ہر نبی نے اپنی دعوت کی ابتدا کی۔ یہ چند حرفی اعلان در اصل اسی انقلابی مشن کا ایک اجمالی مینیفسٹو ہے جس کو قرآنی اصطلاح میں اقامت دین کہتے ہیں۔ یعنی ہر نبی نے آتے ہی اپنے اس نصب العین کا اظہار کیا اور لوگوں کو اس کی طرف بلایا اور خود اس کے لیے عملی سعی و جہد شروع کر دی کہ خدا کی زمین پر صرف اسی کا نازل کیا ہوا ضابطہ حیات نافذ ہو اور نافذ رہے۔ "عبادت" "الٰہ" اور "طاغوت" کے موجودہ بے جان تصورات کے پیش نظر اس بات کے اندر کچھ مذہبیانہ غلو محسوس ہوگا کہ ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہر نبی نے اقامت دین کی جد و جہد شروع کر دی۔ لیکن قرآن نے اس وہم کا خود ہی استیصال کر دیا ہے اور صاف صاف بتا دیا ہے کہ حاملین توراۃ و انجیل و قرآن ہی کو یہ فریضہ نہیں سپرد کیا گیا تھا بلکہ ہر نبی کا مقصد بعثت یہی تھا:-

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ (شوریٰ-۲)

اس نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی (پیروی کی) نوح کو وصیت کی تھی اور جس کی (اے نبی) تمہارے اوپر وحی کی ہے اور جس کا حکم نے ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ (وغیرہ تمام انبیاء اور ان کے پیروؤں) کو حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ اس دین کو قائم کرو۔

غرض قرآنی تصریحات گواہ ہیں کہ بلا استثناء ہر نبی کو اللہ واحد کے نازل کردہ دین کی دعوت اور اقامت کا فرض سپرد کیا گیا تھا اور پھر قرآن ہی اس بات پر بھی گواہ ہے کہ ہر نبی نے اس امر الٰہی کی بجا آوری اس شان سے کی کہ نہ تو کبھی اس دعوت کے کامیاب ہونے پر خدا سے گارنٹی طلب کی، نہ ایک لمحہ اس کے انجام پر فکر و تامل میں ضائع کیا، نہ اس کے امکان اور عدم امکان کا ان کے ذہنوں نے سوال اٹھایا، نہ حالات کی ناسازگاری ایک آن کے لیے ان سے اس آواز کو سینہ میں دبا رکھنے کا مطالبہ کر سکی۔ بلکہ ہر ایک نے اپنی بعثت کی ابتدا سے زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے اس فرض کو پورا کیا۔ ان میں اگر کچھ ایسے تھے کہ ان کی دعوت الی الحق نے کامیابی حاصل کی اور وہ دنیا چھوڑنے سے پہلے سچے خدا پرستوں کا ایک گروہ پیدا کر گئے تو بہتیرے ایسے بھی تھے جن کی آواز آخر تک بے حس دلوں کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس ہوتی رہی۔ نوح علیہ السلام نے تقریباً ایک ہزار سال کے لیل و نہار اس ادائے فرض میں صرف کر ڈالے مگر اس طویل اور صبر آزما سعی کا انجام ان گالیوں اور پتھروں کی شکل میں نمودار ہوتا رہا جن سے ان کی "قوم" رات دن ان کو نوازتی رہتی تھی۔ اور جب ان کی ادائیگی فرض کا زمانہ ختم ہوا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو ان کی دعوت قبول کرنے والوں کی تعداد گنتی کے چند افراد سے زیادہ نہ تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے بڑھاپے کی عمر تک اس عبادت اللہ اور اجتناب طاغوت کا پیغام سنایا اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے لگاتار کوششیں کرتے رہے؛ اس کوشش اور پیغام رسانی کے دوران میں انھیں جن جن ابتلاؤں اور جانکاہ مصیبتوں سے گذرنا پڑا، ان کے تصور ہی سے دل کانپ اٹھتا ہے لیکن اس ساری تگ و دو اور ان پیہم قربانیوں کا ثمرہ یہ نکلا کہ ان کے اپنے اہل و عیال کے سوا مشکل ہی سے کوئی ان کی آواز پر لبیک کہنے والا تھا۔ حضرت لوط، شعیب، ہود، صالح اور عیسیٰ وغیرہ انبیائے کرام کے سوانح حیات میں کم و بیش اسی قسم کے حالات و مناظر دکھائی پڑتے ہیں۔ پھر اسی طائفہ میں حضرت یحییٰ اور انہی کی طرح کے کچھ دوسرے انبیاء بھی موجود ہیں جن کی تبلیغ ہدایت کا انجام یہ نظر آرہا ہے کہ کلمۂ حق سننے والا تو ایک فرد بھی نہ ملا لیکن کسی کی گردن پھانسی کے پھندوں میں دیدی گئی اور کسی کے سر پر آرے چلا دیے گئے ـــــ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ نبوت اس حقیقت کا سب سے بڑا شارح ہے۔ آپ کو اسی پیغام کے ساتھ، جو ہر نبی کو برائے تبلیغ ملا تھا اور اقامت دین کے اسی مشن کو دے کر، جس کو ہر نبی لے کر آیا تھا، مبعوث فرمایا گیا، ایک طرف تو یہ پیغام بھی پہلے کی بہ نسبت کامل اور وسیع المعانی تھا، دوسری طرف مخاطب ایک مخصوص سرزمین کے بجائے پورا ربع مسکون تھا۔ اور اس "ربع مسکون" کا حال یہ تھا کہ اس کے ایک ایک گوشہ میں طاغوت کا علم گڑا ہوا اور کفر و شرک کا اندھیر چھایا ہوا تھا۔ اس حال میں خدا کا یہ آخری پیامبر آتا ہے اور آتے ہی وہی بات بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنے لوگوں کو سناتا ہے جو ہر نبی سناتا آیا ہے۔ تدریجاً دعوت کا حلقہ وسیع ہو رہا ہے یہاں تک کہ پورے تین سال بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ اللہ کی جناب سے تبلیغ و اعلان عام کا حکم دے دیا جاتا ہے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ (حجر) جس بات کا تجھ کو حکم دیا گیا ہے اس کو دانشگاف کہدو اور مشرکوں کی پروا نہ کرو

خدا کا نبی امتثال امر کے لیے فوراً تیار ہو جاتا ہے اور جو بات اب تک وہ اپنے عزیزوں اور قرابت داروں سے گھروں کے اندر اور دیواروں کے پیچھے سنایا کرتا تھا اسے اب پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ کر سارے عرب و عجم کو ہانکے پکارے سنانے لگا، سننے والوں نے جس طرح اس پکار کا جواب دیا اس کو مکہ اور طائف کی گلیاں قیامت تک نہ بھولیں گی۔ لیکن خدا کے اس فرض شناس بندے کو ان باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی، اس کو اگر پروا ہوتی ہے تو یہ کہ جس کلمۂ حق کی تبلیغ و تفہیم کا فریضہ مجھ پر عائد کیا گیا ہے اس کے سنانے سمجھانے میں کوئی کسر نہ رہ جائے اور جس صداقت پر ان گم کردہ راہوں کی فلاح و نجات منحصر ہے اس کو یہ سنتے اور مانتے کیوں نہیں! اس کی ساری تمنائیں اس ایک آرزو میں آکر سمٹ گئی ہیں کہ کسی طرح میری بات دلوں میں اتر جائے اور جس ہدایت کو اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ نازل فرمایا ہے اس کو یہ لوگ قبول کر لیں۔ مگر اللہ تعالیٰ ہے کہ آپ کو بار بار محبت کے ساتھ جھڑکتا ہے اور یہ حقیقت ذہن نشین کراتا ہے کہ تمھارا کام صرف پہنچا دینا اور کھول کھول کر امر حق بیان کر دینا ہے، اگر ایک شخص بھی اس امر حق کو سن کر نہیں دیتا تو اس کی کوئی پروا نہ کرو (فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ الْمُبِينُ) یہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر کچھ اپنا ہی بگاڑیں گے، تمھارا کچھ نہ بگاڑیں گے۔ تم اپنی اس دعوت کا کام انجام سے بے پروا ہو کر بجا لاتے رہو۔ یہ نہ سوچو کہ کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے اس دعوت کو کامیاب اور اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دشمنوں کو تباہ و برباد دیکھو اور اس کا بھی امکان ہے کہ ایسا نہ ہو۔

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ (یونس)

اور اے پیغمبر! جس عذاب کی ہم ان منکروں کو دھمکی دے رہے ہیں یا تو اس کا کچھ حصہ ہم تم کو دکھلا دیں گے (اور تمھاری نگاہوں کے سامنے ہی یہ اپنے انجام بد سے کسی قدر دوچار ہو لیں گے) یا تم کو وفات دے دیں گے۔ سو ہماری ہی طرف تو ان کو پلٹ کر آنا ہے۔ پھر (یہ یقین رکھیں کہ) ان کے سارے اعمال خدا کی نگاہ میں ہیں۔

بعثت محمدی پر ایک دوسرے پہلو سے بھی غور کیجیے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ ہدایت کے بعد ساری دنیا کا بالعموم اور قوم عرب کا بالخصوص، دو میں سے ایک نتیجہ ہونے والا تھا۔ یا تو وہ اس پر ایمان لا کر اللہ تعالیٰ کی رحمت بے کراں سے سرفراز ہو یا انکار کر کے ہمیشہ کی لعنت اور دائمی عذاب خرید لے۔ ایک معمولی انسان بھی اپنی قوم کو اس طرح نذر ہلاکت ہوتا دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا، کجا کہ وہ انسان جو محبت و رافت کا پیکر اور رحمۃ للعلمین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اکثر ناعاقبت اندیشوں نے اس حق کی تکذیب اور مخالفت کر کے ہلاکت کی راہ چلنی چاہی تو آپ کا دل خون ہونے لگا، اس فکر میں کہ کسی طرح یہ لوگ راہ راست پر آجائیں، زندگی کا ایک ایک لمحہ سخت قلق اور اضطراب میں گزرتا تھا، رات کی رات اس الحاح و زاری میں بسر ہو جاتی تھی کہ خدایا! اس قوم کو ہدایت دے، اس کے دلوں کی آنکھیں کھول دے کہ وہ تیرے غضب سے بچ جائیں۔ یہ جوش رافت اور جذبۂ خیر سگالی اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ حالت شرک میں مرجانے والوں کے حق میں بھی دعائے استغفار کرنے سے آپ باز نہ رہ سکتے اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ اٹل فیصلہ سنا دیا کہ "ان کے لیے دعائے مغفرت نہ کرو، اگر تم ایک بار نہیں ستر بار استغفار کرو تو بھی میں ان کو بخشنے کا نہیں"۔ رحمت عالم کی زبان پکار اٹھی "خدایا! میں ان کے لیے ستر بار سے بھی زیادہ استغفار کروں گا"۔ آپ سے بڑھ کر اس امر واقعہ کا کون ادراک رکھتا تھا کہ یہ قوم اس خطرناک آزمائش میں صرف میری بعثت کی وجہ سے ڈالی گئی ہے جس کا اگر ایک پہلو روح پرور ہے تو ساتھ ہی دوسرا پہلو جانگداز بھی ہے۔ اگر ایک طرف خلافت ارضی کی سرفرازیاں اور فردوس بریں کی بہاریں ہیں تو دوسری طرف غضب الٰہی کی ہلاکت خیزیاں اور عذاب جہنم کی الم ناکیاں بھی ہیں، اور قوم ہے کہ اسی دوسرے پہلو کو اختیار کرتی اور اسی دوسری طرف جانے پر اصرار کر رہی ہے۔ لیکن پیغمبر عالم یہ سارا دہشت ناک ڈراما اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اپنے کو مجبور محض پا رہا تھا اور قوم کے درد میں تڑپنے کے باوصف اس صورت حال میں کسی ادنیٰ تغیر کی بھی مجال اور گنجائش نہ دیکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ میری ہی دعوت لا الٰہ الا اللہ کا ثمرہ ہے کہ شاید یہ قوم عاد و ثمود کی طرح پیوند خاک کر دی جائے، ممکن ہے یہود کی طرح ابدی لعنت میں مبتلا ہو جائے، ہو سکتا ہے کہ جنگ و جدال کی نوبت آئے، بھائی بھائی کا گلا کاٹنے لگے، باپ بیٹے کے خون کا پیاسا ہو جائے، یعنی رشتے کٹ جائیں، خاندان تباہ ہو جائیں، وطن تاراج ہو جائے ـــــ لیکن ادائے فرض کی ناگزیری کا کیا علاج! سینہ بھنچتا ہے تو بھنچے، دل تفکر و تحسر کے ہجوم سے مضطرب ہے تو مضطرب رہے، کندھے اس بار گراں کے دباؤ سے شل ہوتے ہیں تو ہو جائیں، اور کمر اس بوجھ سے دو نیم ہو رہی ہے تو ہو جائے، مگر یہ کوئی اپنی سوچی ہوئی اسکیم تو نہیں ہے کہ ملتوی یا ترک کی جا سکے، یہ تو بھیجنے والے کا مقرر کیا ہوا "فریضۂ زندگی" ہے جس کو ہر حال میں پورا ہونا چاہیے ـــــ پیغمبر کے دل کے یہی سارے جذبات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں جو ان آیات کے اندر جھلک رہے ہیں:۔

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ قُل لَّوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُم بِهِ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ

(یونس - ۲)

اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے اس بات کا ذرا استحقاق نہیں کہ بطورِ خود اس قرآن میں کوئی رد و بدل کروں۔ میں تو بس اسی چیز کا تابع ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھ کو ایک بڑے دن کی سزا کا ڈر ہے، اور کہو اگر اللہ کو منظور ہوتا تو میں یہ قرآن تمھیں پڑھ کر سناتا ہی نہ اور نہ وہ تم کو اس کی اطلاع دیتا، چنانچہ اس سے پہلے میں تمھارے اندر ہی ایک عمر گزار چکا ہوں (اس وقت تو میں نے کوئی چیز تمھارے سامنے نہیں پیش کی تھی کہ اب یہ قرآن اپنے جی سے بنا کر تم کو سنانے لگا) کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔

لوگوں کا — "حالاتِ زمانہ سے واقف" اور "مصلحت شناس" لوگوں کا — مطالبہ یہ تھا کہ جس قرآن کو آپ پیش کر رہے ہیں اس کی تعلیمات ہماری قومی نفسیات سے میل نہیں کھاتیں نہ "احوال و ظروفِ حاضرہ" سے سازگاری رکھتیں، اس لیے اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لائیے جس میں یہ "خامیاں" نہ ہوں، یا اسی قرآن میں کچھ اس طرح کی ترمیم و اصلاح کر دیجیے کہ اس ماحول میں ٹھیک فٹ ہو سکے (ائْتِ بِقُرْآنٍ أَوْ بَدِّلْهُ ۔ (یونس-۲) ورنہ اگر آپ نے من و عن اسی قرآن اور اس کی تعلیمات کی تعلیم و ترویج پر اصرار کیا تو یاد رکھیے ایک فتنہ اٹھے گا اور قومی عمارت کے ایک ایک گوشہ کو تہ و بالا کر کے رکھ دے گا۔ پیغمبر یہ خطرہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، بلکہ وہ خطرہ بھی جو آنے والی زندگی سے متعلق تھا۔ ان دور بینوں کی تذکیر کا محتاج نہ تھا، مگر ساری بات کی ایک بات یہی تھی کہ آخر وہ کرتا تو کیا کرتا سوا اس کے کہ حسرت و اندوہ بھرے لہجے میں ان کو یہ سنا دے کہ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي الخ

یہ انبیاء کے ان احوال و سیر کے چند مشہور و مستند حقائق اور واقعات ہیں، جو سوجھ بوجھ رکھنے والوں کی عبرت پذیری اور حق نمائی کے لیے قرآن حکیم میں بیان کیے گئے ہیں، ان واقعات میں جو اصولِ حق سب سے زیادہ نمایاں اور جو نقشِ حقیقت سب سے زیادہ ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ یہی ہے کہ اللہ کے دین کی اقامت کے لیے کوئی شگون لینے کی ضرورت نہیں نہ حالات کی سازگاری کا کوئی اندازہ لگانے یا کامیابی کے امکانات ٹٹولنے کی گنجائش ہے۔ جو چیز ہمارا فریضۂ زندگی قرار پا چکی، وہ ہر حیثیت سے اس بات کی مستحق ہے کہ جب تک زندگی ہے اس کے لیے جد و جہد کرتے رہیے۔ وہ فرض، فرض نہیں جس کو مشکلات کے اندیشے منسوخ کر دیں، جو امکان و عدمِ امکان کی بحثوں کا زخم کھا سکے۔ اگر دعوتِ توحید اور اقامتِ دین کا کام شروع کرنے سے پہلے امکانات کا ٹٹولنا ممکن ہوتا تو یقین جانیے انبیاء کی ایک بڑی تعداد اپنے مشن کا اظہار تک کرتی اس کے لیے سعی و کوشش تو درکنار۔ کیونکہ عموماً ہر نبی توحید کی دعوت اور اقامتِ دین کا مشن لے کر دنیا میں بھیجا ہی اس وقت جاتا تھا جب حالات کی ناسازگاری اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، جب کلمۂ حق کا نشو و نما بظاہر ناممکن سے ناممکن تر ہو چکا تھا، جب صدائے توحید بلند ہوتے ہی ہر طرف سے کنکر پتھر برسنے لگتے تھے۔ لیکن حالات کی اس شدید نامساعدت، مشکلات و موانع کی اتنی زبردست مزاحمت اور امکان کامیابی کی اس انتہائی قلت کے باوجود، جس سے ہم اپنے موجودہ حالات کا کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقابلہ نہیں کر سکتے ۔ انھوں نے کشتی بحرِ ظلمات میں ڈال دی اور ذرا نہ سوچا کہ ساحل کہاں اور کدھر ہے؟ موسم پُرسکون ہے یا طوفانی؟ بادبان ٹھیک ہے یا نہیں؟ ہوا کا رخ کیا ہے؟ کشتی کھینے والے بازوؤں میں توانائی کتنی ہے؟ سمندر پیداکنار ہے یا ناپیداکنار؟ راستہ صاف ہے یا زیر آب چٹانیں ہیں؟ انھوں نے ان میں سے کسی بات پر بھی تامل نہ کیا۔

مشکلات راہ اس فرض کی اہمیت کم نہیں زیادہ کرتی ہیں۔

اب اگر ہم نے انبیاء کے قصص و احوال کو مشرکین عرب کی طرح اساطیر الاولین کی حیثیت دے رکھی ہے اور ان کو زمانۂ قدیم کی ایسی داستانیں سمجھ بیٹھے ہیں جن کی ہم اپنی زندگی کا سفر طے کرنے میں کسی قسم کی احتیاج نہیں رکھتے سوا اس کے کہ آیات قرآنی سمجھ کر محض حصول ثواب کے لیے ان کی تلاوت کر لینی چاہیے تب تو بات ہی اور ہے لیکن اگر واقعہ یہ نہیں ہے اور ہماری بدبختیوں نے ابھی تک ہم کو نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ کی حد تک نہیں پہنچایا ہے بلکہ ہم ان قصص کو اسی طرح مشعل ہدایت اور منبع اعتبار و بصیرت یقین کرتے ہیں جس طرح قرآن نے ہم کو بتایا ہے تو ہم انبیاء کی اس مقدس تاریخ کے ہر دور اور ہر ورق سے یہی ایک غیر متغیر اصول سیکھ سکتے ہیں کہ جس چیز کو ہمارے پروردگار نے ہمارا مقصد زندگی ٹھیرا دیا ہے اس کی خاطر جد و جہد ہر حال میں ہونی چاہیے۔ بحر یہی کہ یہ جد و جہد ہر حال میں ہونی چاہیے اور اس کے لیے مشکلات راہ اور ناسازگاری احول کا کوئی لحاظ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ دیکھتے ہوئے کہ ہر نبی بالعموم ایسے وقت میں اس کام پر متعین کیا جاتا رہا ہے جب کہ حق و ایمان کی روشنی اس زمین سے بالکل مفقود ہو چکی تھی اور کفر و مادیت کی آفاق گیر تاریکی میں اس جد و جہد کے لیے امکان کامیابی کی کوئی کرن دور دور تک کہیں نظر نہیں آتی تھی، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ جد و جہد ایسے ہی ماحول سے مانوس ہے اور جس زمانہ میں لوگ حق سے جتنا ہی زیادہ بیگانہ ہوں، دہریت و مادیت کی جتنی ہی زیادہ گرم بازاری ہو اور طاغوت کی حکمرانی جتنی ہی زیادہ وسیع، ہمہ گیر اور مستحکم ہو، علمبرداران حق پر اقامت دین الٰہی کا فریضہ اتنا ہی زیادہ اہم اور سنگین ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر حالات کا یہ صحیح اندازہ ہے کہ دنیا حق سے اتنی ہی برگشتہ اور متنفر ہو چکی ہے کہ اس کو دین حق کا نام بھی سننا گوارا نہیں تو یہ اقامت دین کی جد و جہد میں کسی تعطل یا تخفیف کا باعث نہیں ہے بلکہ اس میں انتہائی سرگرمی، جوش اور انہماک کا طالب ہے۔

فریضۂ زندگی کا مقام اہل کفر کی نگاہوں میں

زندگی کا یہ اصل الاصول کہ نصب العین کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ امکان و عدم امکان کی بحثوں کا متحمل نہیں ہو سکتا، ایسا مستحکم اور عالم گیر ہے کہ نہ صرف اسلام ہی نے اس کا اپنے پیروؤں سے مطالبہ کیا ہے اور نہ صرف انبیاء اور ان کے سچے متبعین ہی نے اس پر عمل کر کے دکھایا ہے، بلکہ کافرین اور خالص دہریوں تک کے یہاں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اور وہ بھی فریضۂ زندگی کا مقام یہی سمجھتے ہیں کہ وہ حالات کی سازگاری اور ناسازگاریوں سے بے نیاز اور بہر صورت زندگی کے آخری سانس تک ایک سعی پیہم کا مستحق ہے۔ چنانچہ ان کی تاریخ میں اس کے بے شمار شواہد پائے جا سکتے ہیں:

مارکس کے پیرو اس کے چند مخصوص نظریاتِ زندگی پر ایمان لائے اور انہی نظریات کی "اقامت" میں انھوں نے مصائب انسانی کا علاج یقین کیا، اس لیے یہی چیز ان کی زندگیوں کا نصب العین قرار پا گئی اور انھوں نے اس کی ترویج عام کے لیے پوری قوت سے جہاد شروع کر دیا، یہ جہاد اس مملکت میں شروع کیا گیا جس پر دنیا کی سب سے مستبد حکومت مضبوطی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھی اور جہاں زار کی مطلق العنانیت اور مختاریت کے خلاف سانس لینا بھی بظاہر ممکن نہ تھا، مگر اشتراکی اصولوں پر معاشرہ اور حکومت کی تنظیم کو اپنا فریضۂ زندگی قرار دینے والوں نے ان مصائب و آلام کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں جو اس جدوجہد کے پردے میں چھپے انھیں گھور رہے تھے۔ جب زار کے کانوں تک ان کی سرگرمیوں کی اطلاع پہنچی تو "تہذیب و ترتیب کے تمام اسلحوں سے مسلح ہو کر پوری خشمناکی کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑا۔ کتنوں ہی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو موت کے چنگل سے بچے ان کو سائبیریا کے برفستانی جہنم میں جھونک دیا۔ ظلم اور ایذا دہی کی کوئی ایسی ممکن صورت نہ تھی جن سے ان کو سابقہ نہ پڑا ہو۔ سالہا سال تک یہی ہنگامۂ دار و گیر برپا رہا مگر کوئی بڑے سے بڑا حادثہ ان کے پائے عزیمت میں لغزش نہ پیدا کر سکا اور اشتراکیت کا عشق آلام و مصائب کے بیچ دھارے سے ان کو تیراتا اور منزل مقصود کی طرف ان کے قدم بڑھاتا رہا۔

انہی اشتراکیوں میں آگے چل کر، جبکہ وہ زار کا تخت سلطنت الٹ کر اپنا اشتراکی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے، باہم اختلاف ہو گیا۔ لینن کی وفات کے بعد سیاست کی باگ ڈور اسٹالن کے ہاتھوں میں آگئی جس نے آہستہ آہستہ اشتراکی نظام سلطنت کو بین الاقوامیت کی سطح سے ہٹا کر قومی اشتراکیت کی سطح پر لانا شروع کیا۔ اس کی اس پالیسی سے جو دراصل اصول اشتراکیت سے صریح تجاوز اور ان کے ساتھ کھلی ہوئی غداری اور منافقت تھی، ٹراٹسکی نے اختلاف کیا اور اشتراکیت کی اصلی روح کے قیام اور خالص مارکسیت کی بقا پر زور دیا۔ اسٹالن نے نہ صرف اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا بلکہ اس کو اس جرم کی پاداش میں مجلس حل و عقد سے نکال باہر کیا، خفیہ پولیس نے اس کے اور اس کے حواریوں کے منہ بند اور ہاتھ پاؤں باندھ دیے، مگر وہ جن اصولوں کا عقیدت کیش تھا اور جن کے قیام و بقا میں اس کو خلائق کی فلاح نظر آ رہی تھی، ان کی تبلیغ سے باز نہ رہا، آخر کار جلاوطن کر دیا گیا، امریکہ پہنچا اور وہاں سے اپنے اصولوں کی اشاعت کرنے لگا اور اپنے نصب العین کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس کے مشن کے دشمن وہاں بھی پہنچے اور ایک روز خفیہ سازشوں کے ذریعہ اس کے سامنے موت کا پیالہ پیش کر دیا اور مارکسیت کے اس "مومن قانت" نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ اس پیالہ کو قبول کر لیا۔

یہ تو کچھ پرانی باتیں ہیں، ذرا قریب آئیے، یہ جاپانی اور جرمن قومیں جو زخموں سے چور آپ کے سامنے پڑی ہیں، ان کے رہنماؤں نے ان کے سامنے ایک نصب العین رکھا، وہ اس پر ایمان لائیں، اور پھر اس کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو گئیں، حریفوں نے آگا روکا، انھوں نے نوک شمشیر اس روک کو دور کرنے کی ٹھان لی، میدان کارزار گرم ہو گیا، بخت و اتفاق نے جو پانسہ پلٹا تو جیتتی ہوئی قومیں پیچھے ہٹنے لگیں، شکستوں اور تباہیوں کے طوفان نے گھیر لیا، مگر اپنے مطاع مطلق کا جذبۂ اطاعت اور مطمح نظر کا عشق تھا کہ ان کے نوجوان موت کو منہ کھولے ہوئے دیکھتے اور اس میں کود پڑتے، ہوائی جہازوں سے چھلانگ لگاتے اور بم لے کر سیدھے دشمن کے جنگی جہازوں کی چمنیوں میں جا گھستے، بموں سے لدا ہوا پورا جہاز ان بحری جہازوں پر جا گراتے اور اس طرح دنیا کے جنگی لغت میں "خود کش ہوائی جہاز" اور "کفن بردوش طیارے" کے تحیر خیز الفاظ کا اضافہ کر گئے۔ اور اب قدرت نے ان کو اپنی آرزوؤں میں ناکام بنا دیا ہے، وہ اس عقیدے کے ساتھ ہراکری کر رہے ہیں کہ مرنے کے بعد دیوتا بن کر اپنی قوم کی خدمت اور اپنے مقصد کی خاطر جنگ کریں گے اور ان کی عورتیں اپنے نوزائیدہ بچوں کی پرورش یہ کہہ کر شروع کرتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں کہ یہ بڑے ہو کر اپنے دشمنوں اور عظمتِ قومی کے غارت گروں سے انتقام لیں گے۔

یہ ان لوگوں کے نظریے اور کارنامے ہیں جن کا کوئی مستقبل نہیں، جن کی قربانیوں کا انجام اپنی زندگی کے لیے خود ان کے اپنے معتقدات کے مطابق معدومِ محض ہے اور جن کے سامنے اگر کچھ ہے تو صرف اسی دنیائے دوں کے رذیل مقاصد ہیں۔ کیا ان واقعات اور حقائق میں ہمارے لیے کوئی درسِ عبرت ہے؟ کیا رضائے الٰہی اور سعادتِ ابدی کے حصول میں اتنی گیرائی بھی نہیں جتنی ان حیوانی مقاصد کے حصول میں ہے؟ کیا ایمان باللہ میں اتنی حرارت بھی نہیں جتنی مومنین بالطاغوت کے دلوں میں دیکھی جا رہی ہے؟ کیا حق کی شہادت میں اتنی حمیت بھی نہیں دکھائی جا سکتی جتنی باطل کی شہادت میں آج ظاہر ہو رہی ہے؟ اور کیا فرضِ زندگی کو اتنی اہمیت بھی اہلِ اسلام دینے کو تیار نہیں جتنی یہ کفار دے رہے ہیں؟ انبیائے کرام کے واقعات کو نفسِ حیلہ گر پیغمبرانہ جوشِ تبلیغ اور معجزہ اور تائیدِ روح القدس کا نتیجہ قرار دے کر ٹال سکتا ہے مگر اہلِ کفر و ضلال کی ان سرفروشانہ مساعی کے پیچھے کس معجزہ کا سراغ بتایا جائے گا۔ کاش ہم امکان و عدمِ امکان کی بحثیں شروع کرتے وقت باطل پرستوں ہی کے اعمال و اخلاق پر ایک نظر ڈال لیتے اور انہی سے مقصدِ زندگی کا مفہوم سیکھ لیتے۔ افسوس کہ یہ منظر بھی کتنا عبرت ناک ہے، وہ جن کی نظر اسی عالمِ آب و گل تک ہے، ادائے فرض میں فکرِ انجام سے اتنے بے نیاز ہوں اور وہ جن کا دعویٰ ہے کہ "ہماری نماز اور ہماری قربانی، ہماری زندگی اور ہماری موت صرف اللہ کے لیے ہے" آخرت کی ناکامی کی پرستش میں مصروف ہیں۔ جو نقشِ حقیقت ایک اندھا کافر بھی ہاتھوں سے ٹٹول کر معلوم کر لیتا ہے وہ ایمان کی روشنی رکھنے والی آنکھوں کو سجھائی نہیں دیتا۔

یہ عقلیت ہے، جذبات پرستی نہیں | اگر یہ بات اپنی جگہ شک سے بالاتر ہے کہ ادائے فرض کے سلسلہ میں امکان کی بحث نہ صرف یہ کہ پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایمان بالقرآن کا مزاجِ لطیف اس کے تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتا اور نہ صرف یہ کہ یہ طرزِ فکر غیر اسلامی ہے بلکہ کوئی غیور اور باحمیت کافر بھی اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، مگر ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ چیز اس وقت کے مصلحت پرست اور عافیت پسند دماغوں میں اتر نہیں سکتی۔ عقل و تدبر کے دعوے دار ایک طعن آمیز تبسم کے ساتھ بول اٹھیں گے کہ "یہ سب جذباتی باتیں ہیں جن کا دنیائے فکر و عمل سے کوئی تعلق نہیں" "اہلِ دانش" کے اس ریمارک کو ہم بھی بڑی خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیتے کیونکہ اتنا بڑا بارِ ذمہ داری اٹھانے اور اتنی پرخطر راہ اختیار کرنے کا خواہ مخواہ کسی کو کوئی شوق نہیں ہے مگر دشواری یہ ہے کہ اس سے ہماری مشکل حل نہیں ہوتی بلکہ اس میں مزید گرہیں بھی پڑ جاتی ہیں۔ پھر وہ عقل جس کی دہائی دی جا رہی ہے، پکار کر پوچھتی ہے کہ ایسا دین قبول ہی کیوں کیا جائے جو بار بار اور تصریح کے ساتھ اس "جذباتی اصول" کی تعلیم دیتا ہو۔ اگر ایک شخص اس دین کی سچائی تسلیم کرتا اور اس کے اتباع کا عہد کرتا ہے تو اس کو لازم ہے کہ وہ دہکتے ہوئے الاؤ کے اندر بھی کود پڑنے میں کوئی پس و پیش نہ کرے اگر اس کے دین کا اس سے یہ مطالبہ ہو۔ لیکن اگر اس کی تعلیمات اور اصول اس کی نگاہ میں جذباتی یعنی ناقابلِ عمل اور غیر معقول معلوم ہوتے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی صداقت کا قائل ہی نہیں اور نہ دین پر ایمان رکھتا ہے بلکہ اس کا ایمان اپنی عقل و فہم پر ہے اور ایمانداری کا تقاضا یہ ہے کہ اس دین کے نام سے اصول و مسائل پر بحث کرنے سے پہلے وہ اپنی پوزیشن کی تنقیح اور تعیین کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن کیا واقعۃً یہ بات جذباتی ہی ہے اور اس اصول کی بنیاد نرے جذبات ہی پر ہے؟ نیز کیا جذبات کا ہماری عملی زندگی میں کوئی دخل نہیں؟ ہر بالغ نظر انسان تھوڑے سے غور و فکر کے بعد اس حقیقت کو پا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کی تعمیر اور رہنمائی سے ان دونوں میں سے کسی چیز کو بھی بے دخل نہیں کیا جا سکتا، یہ البتہ ہے کہ دونوں کے مخصوص اور متعین حدود و اثر و عمل ہیں اور ایک کو دوسرے کے حلقۂ کار میں لے جانے کا مطلب اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں پھینک دینا ہے۔ کسی مقصد کی تعیین تو خالص عقل ہی کرتی ہے اور وہ شخص بڑا ہی احمق ہوگا جو اپنے مقاصد کی تعیین میں جذبات کو بھی رائے دہی کا مستحق گردانے مگر جب عقل ایک شے کو گہرے سوچ بچار کے بعد مقصد زندگی ٹھیرا دے تو پھر آئے عقل محض کے بس کا یہ کام نہیں کہ وہ اس منزل مقصود کی طرف مطلوبہ رفتار سے قدموں کو بڑھا سکے۔ اس وقت وہ جذبات کی دست نگر ہوتی ہے اور یہی جذبات دلوں میں وہ آتشیں قوت عمل اور قدموں میں وہ جوش حرکت و اقدام پیدا کرتے ہیں جن کے بغیر منزل تک رسائی ناممکن ہے، یہ جذبات نہ ہوں تو قوتِ عمل مستِ خواب رہتے ہیں اور بڑے سے بڑا مقصد بھی ان کو جھنجھوڑ کر بیدار نہیں کر سکتا۔ عقل صرف سمت سفر مقرر کرتی اور انجن اور پٹری تیار کرتی ہے مگر اس انجن کو حرکت دینے والی اور منزل مقصود کی طرف دوڑانے والی اسٹیم یہی جذبات ہی مہیا کرتے ہیں۔ جذبات نے انسانی زندگی کی تعمیر میں اپنا یہ حق غاصبانہ طور پر نہیں حاصل کیا ہے بلکہ عقل ہی کا عطا کردہ اور تسلیم شدہ ہے۔ یعنی جس طرح مقاصد کی تعیین میں جذبات سے کام نہ لینا عقلیت ہے اسی طرح ان مقاصد کے حصول میں جذبات سے بیش از بیش کام لینا بھی عقلیت ہے، جذباتیت نہیں ہے۔ اس لیے اسلام کو دین حق مان لینا اور اس کے بعد اس کے مطالبات کو پورا کرنے میں نیت و عمل کرنا دانش مندی نہیں بلکہ دانش فروشی ہے، عقل کا نام لے کر عقلیت کو رسوا کرنا ہی نہیں احساس کمتری، دوں ہمتی، بے غیرتی اور ضعف عزم و ایمان کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔

اسلام اور اقامت دین کا تلازم | اس تقریر سے، جو اوپر گزر چکی، صرف اتنا ہی نہیں ثابت ہوتا کہ اقامت دین کی جد و جہد، امکان و عدم امکان کی بحث سے بالاتر ہے اور اس کو طوعاً یا کرہاً ہر وقت، ہر ماحول اور ہر حالت میں جاری رکھنا چاہیے، بلکہ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اگر حالات کے اندازے اس جد و جہد کی ناکامی کا یقین دلا دیں، حتیٰ کہ اگر کوئی اپنی آنکھوں نوشتۂ الٰہی میں اس ناکامی کو مقدر دیکھ لے تو بھی اس کو اس "سعی" میں جو اس کے نزدیک لا حاصل ہے، لگے رہے بغیر چارہ نہیں۔ کیونکہ یہ دنیا کی عام تحریکوں اور اسکیموں کی طرح کی کوئی تحریک اور اسکیم نہیں ہے کہ اگر اس کی کامیابی کے ذرائع مفقود اور امکانات ناپید نظر آئیں تو اس کو ترک یا ملتوی کر دینا جائز اور ممکن ہو سکے نہ مسلمانوں کے سر پر یہ کوئی اوپر سے چپکی ہوئی چیز ہے کہ چاہا تو قبول کر لیا اور جب چاہا اس کو اپنے پروگرام سے خارج کر دیا بلکہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کا لازمی تقاضا ہی یہ ہے کہ اس نے اس دین کی اقامت کے لیے اپنے کو وقف کر دیا ہے۔ اللہ پر ایمان لانے اور حق سے محبت کرنے کا فطری مطالبہ ہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا کو محبوب ہوں اور جو باتیں حق ہوں، انسان ان کو اپنے گرد و پیش زندہ اور کارفرما دیکھے اور اس کے لیے ہمہ دم کوشاں رہے اور ہر اس چیز کو مٹا دینے کے لیے تیغ بکف نظر آئے جو خدا کو ناپسند اور باطل ہوں، چنانچہ اوپر ہم واضح دلائل کے ساتھ یہ بیان کر چکے ہیں کہ جس طرح آگ اور پانی کا اتحاد ممکن نہیں اسی طرح ایمان اور منکرات میں مصالحت ممکن نہیں۔ پس یہ جدوجہد اسلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے علٰحدہ اور اس پر زائد کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی عین روح اور حرکت قلب ہے۔ اگر کسی جاندار کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ زندہ تو ہو مگر اس کے قلب میں حرکت نہ ہو تو یقین رکھیے کہ کسی انسان کے بارے میں بھی یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ہو تو وہ مومن مگر اقامت حق کی تڑپ سے اس کے دل و دماغ خالی اور عملی جد و جہد سے اس کے دست و بازو ناآشنا ہوں۔ اس تڑپ اور جد و جہد سے محروم ہو کر یعنی اس مقصد زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر کے مسلمان کا وجود ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہی سنگ بنیاد ہے جس پر اسلامیت کا قصر تعمیر ہوتا ہے۔ اگر یہ پتھر نیچے سے غائب ہو جائے تو پھر اس قصر کا وجود ہی ممکن نہیں۔ چنانچہ اہل کتاب کے متعلق، جنھوں نے اس مقصد زندگی کو فراموش کر رکھا تھا، قرآن نے صاف صاف کہدیا کہ جب تک تم توراۃ اور انجیل کو قائم نہ کرو، تم کسی اصل پر نہیں ہو اور تمھارا ملی وجود ایک وجود موہوم کے سوا کچھ نہیں۔ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ۔ اس لیے یہ کہنا کہ اس زمانہ میں اقامت دین ناممکن ہے گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان ہونا ممکن نہیں، اور حالات زمانہ کی ناسازگاری کے پیش نظر اقامت دین کی جد و جہد کو ترک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خود اسلام ہی سے دست برداری کی ٹھان لی جائے۔

غلطی افکار کا منبع

بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوگی اور کتنے ہی "ذکی الحس" لوگوں کو تو اس میں خارجیت کی بو محسوس ہونے لگے گی لیکن در اصل یہ استعجاب و استنکار اس غلط ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے کامیابی اور ناکامی کا مفہوم ہی الٹ کر رکھ دیا ہے اور جس کو یہ نہیں معلوم کہ فریضۂ اقامت دین کے معنی کیا ہیں؟ اگر یہ ذہنیت تبدیل کر لی جائے اور اس کو صحیح اسلامی قالب میں ڈھال لیا جائے تو پھر نہ تو خطرات و مشکلات کا تصور اس کو پریشان کرے گا۔ نہ امکان اور عدم امکان کا سوال پیدا ہوگا۔

ہماری اصل ذمہ داری

جب یہ کہا جاتا ہے کہ دین کی اقامت ہم پر فرض ہے تو اس کا مطلب بالعموم یہ لیا جاتا ہے کہ زمین پر دین یعنی الٰہی نظام زندگی کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینا ہمارا فرض ہے، حالانکہ جو چیز ہم پر فرض ہے اور جس کی ہم سے اللہ تعالیٰ کے یہاں بازپرس ہوگی وہ دین کو قائم کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کو قائم کرنے کی امکانی جد و جہد کرنا ہے۔ اسی طرح کامیابی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہماری تگ و دو لازماً ایک خالص اسلامی اسٹیٹ قائم کر دینے پر منتج ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے بلکہ درحقیقت یہی ہے کہ ہم اس راہ میں اتنی جانفشانی، قربانی، فدائیت اور سعی و جہد کر دکھائیں جو ہمارے بس میں ہو۔ جس نے یہ کر لیا وہ اپنے مقصد زندگی کو پورا کر گیا اور اپنے مشن میں ہر طرح کامیاب رہا اگرچہ ایک شخص نے بھی اس کی بات نہ مانی ہو اور ایک ذرہ زمین پر بھی وہ دین حق قائم کر دینے میں کامیاب ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر اتنا ہی بوجھ ڈالا ہے جتنا وہ اٹھا سکتا ہے۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ اس نے کسی انسان کو ایسی بات کی تکلیف نہیں دی ہے جو اس کی فطری صلاحیتوں اور قوتوں سے زائد ہو۔ مثلاً اس نے ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو مگر اس کا یہ مطالبہ ہماری فطری استطاعت سے بڑھ کر اور غیر محدود نہیں ہے بلکہ اسی حد تک ہے جتنا انسانی فطرت کے بس میں ہے، چنانچہ فرمایا:۔

اِتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (تغابن - ۲)　　　اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جہاں تک تمھارے بس میں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اعداء دین کا مقابلہ کرنے اور ان کا زور توڑنے کے لیے تیار رہیں مگر ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے دشمنوں کی قوت جنگ کے برابر قوت فراہم کریں بلکہ صرف اتنا کہا گیا ہے اور اتنا ہی ان پر واجب کیا گیا ہے کہ:۔

اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ الخ (انفال-۸) دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اتنی قوت تیار رکھو جتنی تم کر سکتے ہو۔

ان آیات سے جو اصول ہاتھ آتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری حدود استطاعت سے محدود ہے۔ پس اقامت دین کے معاملہ میں بھی حالات زمانہ، مشکلات راہ، ناسازگاری ماحول، قلت ذرائع، ان سب چیزوں کا الاؤنس انسان کو ملے گا اور ان کے لحاظ سے مختلف انسانوں کی کوششوں میں نمایاں تفاوت ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کے روبرو صرف اسی حد تک جوابدہی کرنی پڑے گی جس حد تک اس کو جدوجہد کرنے کی طاقت میسر ہے۔ اگر ایک شخص کو سامان کار اور سازگاری ماحول نصیب ہے لیکن اس نے اپنی طاقت سے بال برابر بھی کم جدوجہد کی تو یقیناً ادائے فرض کی کوتاہی کا مجرم قرار پائے گا خواہ ظاہری نتائج کے اعتبار سے اس راہ میں وہ دوسروں سے کتنا ہی آگے کیوں نہ نکل گیا ہو۔ بخلاف اس کے اگر ایک انسان نے اپنی تمام ممکن کوششیں صرف کر ڈالیں لیکن سر و سامان کار کے ناپید اور حالات کے ناموافق ہونے کے باعث آخر تک منزل مقصود کی طرف منہ کیے ہوئے وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا جہاں سے اس نے اپنی مہم کا آغاز کیا تھا تو وہ ہر طرح سے اپنے فرض کو ادا کر گیا۔ غرض انسان کو چاہیے کہ جن حالات میں جیسی کچھ قوت بھی حاصل ہوتی جائے اپنی جدوجہد کا دائرہ اسی لحاظ سے تنگ یا وسیع کرتا رہے۔ اس چیز کو ایک عام مثال سے سمجھیے۔ نماز انسان پر فرض ہے اس میں قیام اور رکوع و سجود بھی فرض ہیں۔ ایک شخص اگر قیام پر قادر ہونے کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز نہیں ہوتی۔ اور اگر کسی واقعی مجبوری کی وجہ سے وہ بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو اور دو رکعتیں پڑھ چکنے کے بعد ہی اس کی مجبوری دور ہو جاتی ہو اور اب وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر ہو گیا ہو لیکن اس کے باوجود بیٹھا نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز نہ ہوگی بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ جیسے ہی اس کو زوال عذر اور قدرت قیام کا احساس ہو، فوراً کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ بالکل یہی حال اقامت دین کی جدوجہد کا بھی ہے۔ جس شخص کو جس وقت جتنی قوت میسر ہو اس وقت اتنی قوت صرف کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ اس سے زیادہ کا وہ مکلف نہیں اور نہ اس سے کم ہی اس کی چھٹی ہے۔ زمین پر مکمل طور پر اللہ کے دین کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینا ایک آخری غایت (Goal) ہے۔ جہاں تک پہنچنے کی ہر مسلمان کو دعوت دی گئی ہے، مگر وہاں بہر صورت پہنچ جانا واجب نہیں قرار دیا گیا ہے، جو کچھ واجب ہے وہ یہ کہ اس گول کی طرف اتنے قدم آگے بڑھو جتنے بڑھ سکتے ہو۔

ناکامی ناممکن ہے

جب اقامت دین کی فرضیت کا مدعا یہ ہے تو یہ کہنا کتنی بڑی نادانی ہے کہ چونکہ بحالت موجودہ کامیابی کا کوئی امکان نہیں اس لیے ہم اس جدوجہد کو اختیار نہیں کر سکتے۔ جب اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کرنے کی حد ہی تک ہم مکلف ہیں تو پھر اس راہ میں ناکامی کا کیا سوال ہے۔ دنیا کی تمام تحریکوں اور سرگرمیوں میں کامرانی اور ناکامی دونوں کا امکان ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی جدوجہد ایسی ہے جس میں ناکامی کا کوئی امکان نہیں تو یہی اقامت دین کی جدوجہد ہے جس میں بدقسمتی سے ہم کو ہر طرف ناکامی ہی ناکامی نظر آتی ہے حالانکہ اس راہ میں اگر کوئی ناکامی ہے تو صرف یہی کہ اپنی قوت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو اس میں خرچ کرنے سے دریغ کیا جائے اور اپنی استطاعت کے مطابق کلمۂ حق کی سربلندی میں سعی نہ کی جائے۔ اس کے علاوہ کسی ناکامی کا خدشہ نہیں۔ اس راہ کے چلنے تمام راہوں سے نیارے ہیں اور معیار کامرانی تمام معیاروں سے جدا ہے۔ مومن اپنی قوتیں میدان سعی و جہد میں ڈال دینے کے بعد جس انجام سے بھی دوچار ہوتا ہے وہ بہرحال فتحمندی و کامرانی ہے، مایوسی و نامرادی کے تو نام سے بھی اس کی جد و جہد آشنا نہیں۔

کامیابی کا اسلامی تصور اس بارے میں جو چیز مسلمانوں کی نگاہوں کا حجاب بن گئی ہے وہ اشیا کی قدریں متعین کرنے کا وہ مادی اصول ہے جو آج ہر چہار سو چھایا ہوا ہے۔ لیکن جس کو قرآن مٹانا چاہتا ہے۔ آج مسلمان کسی چیز کے رد و قبول میں اسی عالم کے منافع و مضار کو سامنے رکھتا ہے اسی لیے اس سعی و کوشش کو لاحاصل اور ناکام سمجھتا ہے جس کا کوئی فوری اور مادی فائدہ ظاہر ہوتا ہوا دکھائی نہ دے۔ لیکن قرآن نجاح اور سعادت کا نشان بالکل مخالف سمت میں بتاتا ہے۔ وہ مسلمان کی امتیازی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ آخرت کے مفاد کو دنیا کے مفاد پر ترجیح دینے والا ہے۔ نیز وہ انسان کی کامیابی یہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی تمام کوششوں کو راہ حق اور تلاش رضائے الٰہی میں لگا دے۔ اب اگر وہ پہلے ہی قدم پر اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا ہے تو بھی اور اگر سارے عالم پر دین حق کا جھنڈا گاڑ دے تو بھی، ہر حال میں کامیاب ہے۔

منافقوں کی تمنا بھی تھی اور توقع بھی کہ اب یہ جو روم کے افق سے طوفان جنگ نمودار ہو رہا ہے ان مٹھی بھر مسلمانوں کو، جو تمام دنیا کو دشمن بنائے بیٹھے ہیں، اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور ان کی یہ ساری شان و شوکت ناکامی و نامرادی کی قبر میں دفن ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کو حکم دیا کہ :-

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ (توبہ - ۷)

ان منافقوں سے کہدو کہ تم ہمارے حق میں جس بات کا انتظار کرتے ہو۔ وہ ہمارے لیے دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہی تو ہے۔

دیکھا آپ نے کہ جس طرح مسلمانوں کی فتح بھلائی اور کامیابی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کی شکست کو بھی "احدی الحسنیین" کہہ کر اسی کے برابر کامیابی قرار دے رہا ہے، فتح بھی "حسنیٰ" ہے اور شکست بھی۔ گویا ایک مرد مومن جب جہاد فی سبیل اللہ کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو بہر صورت تمغۂ کامرانی لے کر ہی لوٹتا ہے۔ بے شک یہ کامیابی بہت بڑی کامیابی ہے کہ وہ اپنی تلوار سے دشمنوں کو زیر کرلے اور حق کا بول بالا کردے مگر اس کے برعکس اگر وہ اور اس کے تمام ساتھی میدان جنگ میں قتل ہو جائیں تو جہاں تک ادائے فرض کا تعلق ہے، یہ بھی اسی کے ہم پلہ ایک کامیابی ہے، قابل صد رشک کامیابی۔ ایسی کامیابی جس پر دنیا کی ساری کامیابیاں اور تمام مفادات قربان ہو جائیں، جس سے بڑی کامیابی کی آرزو ہی نہیں کی جا سکتی۔

یہ ایک جزئی مثال تھی جس کا تعلق مومن کی زندگی کے صرف ایک مخصوص گوشہ سے ہے۔ اسی جزء سے کل کی طرف آیئے اور اسی فرع کو اصل بنا کر مومن کی ساری مساعی حیات یعنی مساعی اقامت دین پر پھیلا دیجیے پھر معلوم ہوگا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام جن کو دعوت حق دینے کے جرم میں دار پر لٹکا دیا گیا اور جو ایک بالشت زمین پر بھی دین حق قائم نہ کر سکے اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ٹھیک اسی طرح دنیا سے کامران و بامراد تشریف لے گئے جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنھوں نے ایک وسیع خطۂ ارض پر عملاً اللہ کا دین قائم کر دیا تھا۔ مگر اس راز کو سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے مومن کا دل چاہیے عقلِ مصلحت پرست کے اندر یہ "جذباتی" باتیں کہاں سما سکتی ہیں۔

قیامِ دین کے روشن امکانات لیکن کامیابی کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے، اس کے لحاظ سے بھی ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج کی دنیا میں اس جد و جہد کی ناکامی کی بہ نسبت کامیابی کا زیادہ امکان ہے، اور اگر اس کو اس کے مزاج کے موافق طریقوں پر پوری سرگرمی سے جاری رکھا گیا جس کی توضیح ہم آگے چل کر کریں گے، تو اس کا بار آور ہونا اسی طرح یقینی ہے جس طرح شبِ تار کے بعد آفتاب عالم تاب کا طلوع۔ اس دعویٰ کے اثبات کے لیے آپ کو عام انسانی فطرت، دنیا کے تمدنی وسائل، تہذیب حاضرہ کے پیدا کیے ہوئے حل طلب معاملات اور حق کی ساحرانہ قوت اثر و نفوذ پر ایک گہری نظر ڈالنی چاہیے۔ اور سب سے اول اور آخر اس چیز پر کہ مسئول و مخاطب کون لوگ ہیں؟

عموماً لوگ کامیابی کے امکانات کا اندازہ لگاتے وقت پہلے ہی قدم پر یہ ایک عظیم الشان حقیقت فراموش کر جاتے ہیں کہ اس کا مطالبہ کسی گری پڑی جماعت اور بے اصول، خود غرض، دنی الاخلاق اور پست نظر لوگوں سے نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ ان لوگوں سے کیا جاتا ہے جو مومن ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں اور مومن کی جو ضروری صفات قرآن میں بیان ہوئی ہیں ان کا اجمالی خاکہ یہ ہے کہ "وہ ایک خدا پر ایمان رکھنے والے ہوتے ہیں، اس کے سوا کسی کو معبود و مستعان اور صاحب حکم و امر نہیں سمجھتے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی مانتے ہیں اور اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں ان کے سوا کسی کو قابلِ اتباع نہیں تسلیم کرتے، وہ نماز، روزے، حج، زکوٰۃ وغیرہ عبادات کے بجا لانے والے ہوتے ہیں، حق کے شیدا، سچائی کے مجاہد، معروف کے مبلغ، عدل و قسط کے علمبردار، باطل کے فطری دشمن، منکر کے دائمی محارب، جھوٹ سے متنفر، ظلم سے مجتنب ہوتے ہیں۔ برائی کو نیکی سے اور جہالت کو شرافت سے مٹانا ان کا شیوہ ہے، عدل پر قائم رہنا ان کا شعار ہے اگرچہ اس کی زد خود اپنے ہی اوپر کیوں نہ پڑتی ہو، دشمن کے ساتھ بھی رحم و انصاف کرنے پر مجبور ہیں اگرچہ کتنے ہی مظالم ان کے ہاتھوں جھیل چکے ہوں، ہر حال میں راہ راست پر قائم رہنے والے ہیں اگرچہ تمام دنیا ہاتھ سے نکلی جاتی ہو۔ پھر دوسروں کی عزت کو اپنی عزت سمجھنے والے اور دوسروں کے مال اور جان کو حرمت کعبہ کا مستحق سمجھنے والے ہیں، جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں وہی دوسروں کے لیے پسند کرتے ہیں، ان کے ہاتھ اور ان کی زبان سے کسی کو گزند نہیں پہنچتا، خود ننگے اور بھوکے رہ کر غریبوں کو کھلانے پلانے میں فرحت محسوس کرتے ہیں، یتیموں، بیواؤں اور کمزوروں کے لیے ان کے دامن پناہ گاہ ہیں اور ان کی زندگی، ان کی موت، ان کی محبت، ان کی عداوت سب اللہ کے لیے ہوتی ہے۔"

کم و بیش اسی قسم کے اوصاف کے حامل مومن کہلاتے ہیں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جب اقامت دین کے امکانات پر غور و فکر کیا جائے تو اس گروہ کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے، اس چیز کو نظر انداز کر کے کبھی صحیح نقطۂ نظر نہیں اختیار کیا جا سکتا۔ اس دور میں بھی جب ایمان و دیانت کا شدید ترین قحط ہے، ایسے لوگ نایاب نہیں ہیں اگرچہ کمیاب ضرور ہیں، اس لیے جہاں تک ایسے لوگوں کے وجود کا تعلق ہے ہم اطمینان رکھ سکتے ہیں۔

اس کے بعد دوسری چیز جو قابلِ توجہ ہے وہ انسان کی فطرت ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ باعتبار فطرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسان خیر پسند ہے اور ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر ساری نوع انسانی نیکی کی مقناطیسیت سے کھنچ اٹھنے کی صلاحیت رکھتی ہے، خالص باطل پرست اور شر پسند لوگ دنیا میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں، البتہ جب یہی گنتی کے شیاطین انسانی مشینری پر قابض ہو جاتے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں اہل دنیا کی زمام قیادت چلی جاتی ہے تو عام لوگ ان کے پیچھے چل پڑنے کی وجہ سے بدی کی نجاستوں میں آلودہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے نور حق ان کے سامنے بے حجاب کر کے چمکا دیا جائے تو فطرت انسانی کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ اس کو قبول کر لے گی اور کوئی وجہ نہیں کہ انسان اس چیز کو اس کے اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ دیکھنے کے باوجود رد کر دے جو اس کی فطرت کو مطلوب ہے اور اس چیز سے لپٹا رہے جس سے اس کی اصل فطرت ہم آہنگ نہیں۔ پچھلے زمانوں میں ایک تو انسانی عقل اپنی پختگی کو پہنچی نہیں تھی، دوسرے لوگوں میں گروہی اور مذہبی عصبیتیں حد سے زیادہ ہوتی تھیں۔ اور وہ اپنے دلوں کے دروازے ہر صدائے نامانوس کے لیے مضبوطی سے بند رکھتے تھے، تیسرے تبلیغ و اشاعت حق کے ذرائع نہایت محدود تھے۔ ان اسباب کی بنا پر دین حق کی تبلیغ کے نتائج اکثر ناکامی کی شکل میں نمودار ہوتے، مگر اب حالات بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ انسان تحکمی عقائد کی اندھی پیروی سے باغی ہو کر اور اوہام پرستی سے متنفر ہو کر روز بروز حقائق پسندی کی طرف آ رہا ہے، عقلیں ان اصول و نظریات کو چھانٹ کر دور پھینکتی جا رہی ہیں جو انسانی زندگی کے مسائل کو تسلی بخش طور پر حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مغربی تہذیب اور حریت فکر و رائے نے جہاں دنیا کو بے شمار نقصانات سے دوچار کرا دیا، وہاں ایک ایسی چیز بھی پیدا کر گئی ہے جس سے ایک ایسے دین کو آئندہ چل کر عظیم الشان فوائد حاصل ہونے کی توقع ہے جو مسائل زندگی کا صحیح، متوازن اور اطمینان بخش حل پیش کر سکے۔ اس تہذیب نے ان اوہام کی بنیاد ڈھا دی ہے جو انسانی دماغ کا پردہ بنے ہوئے تھے، ان اوہام کے ڈہ جانے کے ساتھ ہی ان مذاہب کی چھتیں بھی زمین پر آ رہی ہیں جن کی تعمیر ان اوہام پر ہوئی تھی، اور جو صرف جذباتی عصبیتوں کے حصار میں ہی جی سکتے تھے۔ یہ ایک انقلاب تھا، انقلاب کی فطرت ہمیشہ بحرانی ہوتی ہے، اس لیے یہ انقلاب بھی اپنے جوش میں اوہام کے ساتھ بہت سے حقائق کو بھی بہا لے گیا۔ اور دیگر مذاہب کی طرح خود اسلام کو بھی چیلنج کر گیا جو اپنی فطرت اور عقلیت کی وجہ سے اس کا صحیح رہنما ہو سکتا ہے۔ مگر اس بے اعتدالی کے تلخ نتائج اب اس کے علمبرداروں کے سامنے آ چکے ہیں، اور وہ اعتدال کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ اس انقلاب نے ذہنیتوں میں جو بھونچال پیدا کر دیا ہے اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس نے جاہلانہ مذہبی عصبیتوں کی بندشیں ڈھیلی کر کے بڑی حد تک قبول حق کی راہ صاف کر دی ہے اور ایسے بے شمار افراد پیدا کر دیے ہیں جو کسی ایسی بات کے تسلیم کرنے میں اپنے روایتی معتقدات کو ذرہ بھی مانع نہیں سمجھتے جس کی حقانیت ان کے دلوں کو اپیل کر سکے۔ عقل و ذہن کی اس بے تعصبی کے علاوہ تاریخی حقائق بھی کچھ کم قابل اعتنا نہیں ہیں، جب سے نظام عالم کی سیاسی باگ ڈور فاسق و فاجر اور خدا سے باغی ہاتھوں میں آئی ہے اور انھوں نے ہدایت الٰہی کو پس پشت ڈال کر اپنے ذہن و دماغ کے بنائے ہوئے اصولوں پر نظام زندگی کو چلایا ہے اس وقت سے برابر بنی نوع انسان اپنی خود سری کے برے نتائج بھگتتی چلی آ رہی ہے اور انسانی دماغ کے بنائے ہوئے تمام نظام زندگی ایک ایک کر کے ناکام ثابت ہو چکے ہیں، نہ صرف ناکام ثابت ہو چکے ہیں بلکہ ان کی پیدا کی ہوئی پیچیدگیوں اور ان کی نازل کی ہوئی ہلاکتوں سے دنیائے انسانیت چیخ اٹھی ہے اور بڑی بے تابی سے ایک ایسے نظام حیات کی طلبگار ہے جو اس کے دکھوں کا مداوا ہو سکے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب حالات یہ ہیں تو ڈرنے سہمنے اور مایوس ہونے کے بجائے ان لوگوں کو نہایت خوش دلی اور تپاک سے ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے جو فی الواقع اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ حق صرف اسلام کے پاس ہے، عقل انسانی کو مطمئن کرنے اور مسائل زندگی کو تسلی بخش طریقہ پر حل کرنے کی صلاحیت صرف تعلیمات قرآن میں ہے، اس درد کا درماں صرف دین فطرت میں ہے جس سے آج سارا عالم انسانی تڑپ رہا ہے اور وہ آب زلال صرف سرچشمۂ محمدی میں ہے جو دنیا کی تشنہ کامی کو دور اور اس کے پیاسے جگر کو سیراب کر سکتا ہے۔ جن لوگوں نے ان باتوں کو محض موروثی عقیدت کی وجہ سے مان رکھا ہے ان کے متعلق تو ہم جانتے ہیں کہ وہ ان باتوں پر اسی طرح "داد" دے کر خاموش ہو رہیں گے جس طرح کسی اچھے اور خوش کلام شاعر کو اس کے معتقدین دیا کرتے ہیں، ایسے لوگ دین حق کے قیام سے مایوس ہی ہیں اور رہیں گے اور خدا کا دین بھی ان سے مایوس ہے۔ مگر ان لوگوں کے لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں جو دین حق کے ان اوصاف و حقائق پر اپنی عقل اور بصیرت کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں، اور اگر نہیں جانتے تو ان کو جان لینا چاہیے کہ ان حالات میں اگر قرآن کے پیرو اور اللہ تعالیٰ سے حق کی شہادت دینے کا عہد و پیمان کرنے والے "مومنوں" نے جن کی تعداد بفضل الٰہی مایوس کن نہیں ہے اپنے فرائض کو ٹھیک ٹھیک پہچان لیا اور خلق کے سامنے حق کی اس طرح تبیین کی جیسی کہ کرنی چاہیے یعنی اگر انھوں نے اسلام کے اصول و نظریات کو جدید طرز استدلال اور سائنٹفک دلائل سے مدلل کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا اور قوانین الٰہی کو زمانہ حال کی تعبیروں میں ڈھال کر اور مسائل حاضرہ پر ان کو منطبق کر کے لوگوں پر واضح کر دیا کہ انسانی ضروریات کا صحیح حل اور تمدن عالم کی صحیح رہنمائی صرف الٰہی۔ قوانین کر سکتے ہیں۔ پھر اگر انھوں نے اس کے ساتھ شہادت حق کا عملی نمونہ اس طرح پیش کیا کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اسلام کی راہ راست سے ان کا قدم نہ ہٹا، اگر انھوں نے عبادات اسلامی کو بجا لا کر اپنی سیرتوں کی تعمیر کر لی، اگر وہ انفرادی مسائل اور اجتماعی معاملات دونوں میں اسلامی اخلاق پر پوری استقامت کے ساتھ جمے رہے، اگر انھوں نے قومی، وطنی، نسلی، خاندانی، طبقاتی اور ذاتی مفادات سے آنکھیں بند کر کے صرف اسلام کے مفاد کو اپنے سامنے رکھا، اگر انھوں نے ظلم کا جواب عدل سے، تعدی کا جواب قسط سے، بدی کا جواب نیکی سے، جھوٹ کا جواب سچ سے، مکر و فریب کا جواب وفائے عہد اور حسن معاملت سے، اور انتقام کا جواب رحم و انصاف سے دیا، اگر انھوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ ان کی سعی و جہد کا محرک صرف ان اصولوں کی تبلیغ و اقامت ہے جن میں ان کے نزدیک ساری نوع انسانی کی فلاح ہے اور اگر انھوں نے اس سعی و جہد میں حسب ضرورت عیش و آرام کو خیر باد کہنے اور اپنی آرزوں کو پامال کرنے، تباہیاں اور بربادیاں خریدنے اور نقد جان و مال کی قربانیاں دینے میں اتنی ہی استقامت دکھائی جتنی کمیونسٹوں نے کمیونزم کی اقامت میں، جرمنوں نے نازیت کی حمایت و سربلندی میں اور جاپانیوں نے میکاڈو کی رضا جوئی میں دکھائی ہے تو حق کی ساحرانہ قوت تسخیر کا دعویٰ ہے اور خدا کی سنت اس دعویٰ کی گواہ ہے کہ یہ جد و جہد کامیاب ہو کر رہے گی اور دنیا اپنے آپ کو مفتوحیت کے لیے از خود پیش کر دے گی، دل اس کی طرف کھنچ آئیں گے، ذہنوں کے تعصبات کافور ہو جائیں گے۔ اور آنکھیں اس کی طرف فرط عقیدت سے جھک پڑیں گی اور دنیا از سر نو یَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کے روح پرور مناظر دیکھ لے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ آج خدا کی پوری زمین پر باطل کی مضبوط گرفت قائم ہے مگر ہم یہ بھی جانتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں کہ باطل اپنے ابدی اقتدار کا وثیقہ لے کر نہیں آیا ہے، نہ وہ اس زمین کا جائز وارث ہے، قدرت نے زمین کو حق کا مسکن بنایا ہے، جب حق اپنے علمبرداروں کی فرض ناشناسیوں کی وجہ سے اس گھر کو چھوڑ دیتا ہے تو دیو باطل اس خانۂ خالی پر مسلط ہو جاتا ہے مگر جب بھی اس گھر کا اصلی مالک اپنی جگہ لینا چاہتا ہے تو قدرت کے مخفی ہاتھ اس غاصب کو نکال باہر کرتے ہیں، یہ ایک اصول ہے جس کی بنیاد کسی خوش گمانی پر نہیں ہے بلکہ قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ کی ان سنتوں میں سے ایک سنت ہے جن میں کبھی کوئی تغیر نہیں ہوتا، چنانچہ فرمایا:-

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (بنی اسرائیل - ۹) — حق آگیا اور باطل مٹ گیا اصل یہ ہے کہ باطل مٹنے ہی والی شے ہے۔

پس باطل کی زندگی صرف حق کی غیر موجودگی تک ہے، جب حق آئے گا، آئے گا نہیں بلکہ لانے والے اس کو لائیں گے تو باطل خود جگہ چھوڑ دے گا۔ یہ گمان کرنا خدا پر بہتان لگانا ہے کہ مغلوبہ کوششوں کے باوجود حق کا قیام ممکن نہیں، جو خدا اس باطل کے لیے کی ہوئی قربانیوں کو بھی کامیاب بنا دیتا ہے، جو اس کا مبغوض ہے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ اس حق کی خاطر کی ہوئی قربانیوں کو رائگاں جانے دے گا جو اس کو محبوب ہے؟ حالانکہ اس نے وعدہ کیا ہے کہ "جو میرے دین کی مدد کرتا ہے میں اس کی مدد کرتا ہوں" اور قرآن نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ خدا کی پارٹی ہزیمت نہیں اٹھاتی، وہ دشمن کے بالمقابل ہوتی ہے تو اس کی غیبی نصرتیں اور مافوق العادۃ اعانتیں اس کی پشت پناہ ہوتی ہیں، یہاں تک کہ آسمان کے فرشتے اس کے پہلو بہ پہلو لڑنے کے لیے اتر آتے ہیں، اور وہ اپنے سے دس گنے دشمنوں پر بھی غالب آکر رہتے ہیں۔ سو یقین رکھنا چاہیے کہ جو فرشتے بدر و اُحد کے میدانوں میں آئے تھے وہ یہاں بھی آسکتے ہیں اور قرآن بتاتا ہے کہ خدا کے بندے اور حق کے مجاہد جب چاہیں ان کو بلا سکتے ہیں۔ چنانچہ جب غزوہ بدر کے موقع پر نزول ملائکہ کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنی تائید خاص اور نصرت غیبی کا اظہار فرمایا تو ساتھ ہی اس شبہہ کو بھی رفع کر دیا کہ یہ نصرت خاص محض وقتی تھی، اور کھول کر بتا دیا کہ "وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ"۔ فتح و نصرت کی زمام اقتدار خدا ہی کے ہاتھ میں ہے اور جس طرح آج ہے، کل بھی رہے گی، اس لیے کبھی، کسی زمانہ میں بھی، اہل ایمان کو اس تائید و نصرت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یاس و قنوطیت اہل ایمان کے نہیں بلکہ اہل کفر کے خصائص میں سے ہے اور خدا کے ان وعدوں کو، جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، شک اور تردد کی نگاہ سے دیکھنا اس گروہ میں شامل ہونا ہے جس کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ (یہ لوگ خدا کے متعلق خلاف حق اور جاہلانہ گمان کرتے ہیں) ہر مسلمان کو اس گروہ میں شامل ہونے سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ اور اگر وہ قرآن پر واقعی ایمان رکھتا ہے تو اس کو کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے یہ وعدے بھولنے نہ چاہئیں کہ:-

مَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا (طلاق-۱) — جو خدا ترسی کی راہ چلتا ہے خدا اس کے ہر معاملہ میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔

مَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ — جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے (مشکلات اور نقصانات سے) نجات کی راہ پیدا کر دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں کا اس کو گمان بھی نہیں ہوتا اور جو کوئی اللہ پر توکل رکھتا ہے اس (کی کل مشکلات) کے لیے اللہ کافی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور سب سے آخر میں یہ کہ:-

اَلَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت) — جو لوگ ہماری راہ میں سعی و جہد کرتے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں خود کھول دیتے ہیں

ان حقیقتوں کے پیش نظر کسی صاحب فکر کا قیام دین کو ناممکن کہنا قلب و نظر کی بے بصیرتی اور ادائے فرض کی مشکلات سے بزدلانہ فرار کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ بالفرض اگر حالات حاضرہ عدم امکانِ کامیابی کو مستلزم ہیں تو پھر ذرا ان حالات کی نشاندہی کی جائے جن میں کامیابی کا امکان ہو۔ مستقبل کے پردے میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے، اس کا علم تو خدا ہی کو ہے، مگر ماضی کے احوال و مناظر تو قوت حافظہ کی مدد سے بردہ حال پر لائے جا سکتے ہیں، ان احوال کو نگاہ تعمق سے دیکھیے اور پھر بتایئے کہ تاریخ انسانی کے اس پورے سلسلہ میں جو آدم سے شروع ہو کر آج ختم ہوتا ہے، قیام دین کے لیے جتنی کوششیں کی گئیں کیا ان سب کے زمانے اس جدوجہد کے لیے آج کی بہ نسبت لازماً زیادہ سازگار رہتے ہیں؟ کیا حضرت نوحؑ کا زمانہ، جب کہ ساڑھے نو سو برس تک ان پر گالیوں اور پتھروں کی بارش ہوتی رہی، یا حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ، جس میں نمرود کی خدائی قائم تھی، یا حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ، جس میں ہر چہار طرف رومن امپائر کی طاغوتیت چھائی ہوئی تھی، یا حضرت یحییٰؑ کا زمانہ، جبکہ یہودی شیطان ہر صدائے حق کا جواب قتل اور صلیب سے دیا کرتے تھے، یا پیغمبر آخر الزماںؐ کا زمانہ، جبکہ خود مرکز حق تین سو ساٹھ بتوں کا مسکن اور جاہلیت کا دار السلطنت بنا ہوا تھا، یا مجدد الف ثانیؒ کا زمانہ، جب کہ "مسلمان" حکومتِ اسلام کے خلاف اپنا سارا زور صرف کر رہی تھی، یا سید احمد بریلویؒ کا زمانہ جب کہ اہل اسلام کے سینوں پر ایک طرف انگریز اور دوسری طرف سکھ سوار رہتے۔ زمانہ حال کے مقابلہ میں زیادہ سازگار تھے؟ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر زمانہ قیام دین کے لیے اس سے کہیں زیادہ پرخطر اور مایوس کن اور ناسازگار تھا، جتنا آج ہے۔ پس اگر مشکلات و موانع کا لحاظ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آغاز آفرینش سے اب تک ایک فیصدی دور بھی ایسے نہیں آئے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کوئی دور بھی نہیں آیا جو اس جدوجہد کے لیے سازگار رہا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے سخت زمانوں اور ناساعد حالات میں بھی کتنی ہی کوششیں کامیاب ہو گئیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے دنیا جہان کی ناکامیاں اسی زمانہ کے لیے کیوں مقدر مان لی ہیں اور ساری مایوسیوں کو اپنے ہی لیے کیوں مخصوص سمجھ لیا ہے؟

پھر دوسری بات یہ کہ جب ہم نے ادھر سوا سو سال سے اس مقصد کے لیے کبھی براہ راست تگ و دو کی ہی نہیں تو آخر کس تجربہ کی بنا پر ناممکن ناممکن کا ہنگامہ بپا کیا جا رہا ہے؟ ہاں اگر ہم نے فکر و عمل کی ساری قوتوں کے ساتھ طریقہ انبیاء کے مطابق یہ کوشش کرنی ہوتی، اور اس کے بعد بھی ساحل مراد دکھائی نہ دیا ہوتا تو یہ ایک تجربہ ہوتا جو عدم امکان کے دعوے کے حق میں بطور دلیل پیش کیا جا سکتا تھا مگر یہ عجیب ڈھٹائی ہے کہ آپ دریا میں اترتے نہیں اور دور سے کھڑے کھڑے اس کی اتھاہ گہرائی ناپ لینے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ آپ یقین فرمایئے جو ذہنیت آج کے حالات کو ناساعد اور کامیابی کو ناممکن قرار دے رہی ہے وہ قیامت تک امکانات کے حصول میں ناکام رہے گی اور اس ذہنیت کے ماتحت کبھی بھی یہ جدوجہد شروع نہیں کی جا سکتی، جس کفر سے آج وہ لرزاں ہے وہی کل بھی رہے گا خواہ اس کی شکلیں بدلتی رہیں، مگر قیام حق کے لیے ہر کفر کفر ہے وہ اپنے کسی دور اور کسی شکل میں بھی حق کو زندگی کا حق دار سمجھنے کا روادار نہیں ہو سکتا اور نہ ٹھنڈے دل سے اپنے سامنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کو پاؤں جمانے کا موقع دے سکتا ہے۔ جب بھی اقامت حق کے لیے جد و جہد کی جائے گی، کفر اپنے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر سامنے آئے گا اور مختلف اشکال میں وہی تمام زحمتیں، رکاوٹیں، مشکلیں اور مصیبتیں استقبال کے لیے موجود ملیں گی جن کا آج تصور کیا جا سکتا ہے۔ بھولنا نہ چاہیے کہ یہ راہ ہمیشہ خارزاروں اور شعلہ زاروں ہی سے ہو کر گذری ہے، اب یا آئندہ جب بھی گذرے گی انھی کانٹوں اور انگاروں میں سے ہو کر گذرے گی۔ وہ امکان اور سازگاری جس کی آپ کو تلاش ہے اس راہ کے سالکوں کو کبھی ملی ہے نہ مل سکتی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ شک و شبہ کا کوئی گوشہ باقی نہیں چھوڑا ہے۔ اس نے بتا دیا ہے کہ ایمان کا ہر دعویٰ جانی و مالی آزمائشوں کی بھٹی میں ڈال کر تپایا جاتا ہے اور کوئی دعویٰ عند اللہ اس وقت تک قبول نہیں کیا جاتا جب تک وہ اس بھٹی میں تپنے کے بعد اپنے کو کھرا نہ ثابت کر دے۔ حتیٰ کہ اگر بظاہر ایمان کی راہ صاف اور بے خطر نظر آ رہی ہو تو بھی قدرت اس ابتلا کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیتی ہے جن میں اس دعویٰ کی صداقت کا امتحان ہو جائے۔

اب یہ منطق ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ جن ابتلاؤں اور ناسازگاریوں کو سنت اللہ ادعائے ایمان کے امتحان کے لیے ضروری قرار دیتی ہے آپ اس کا استقبال کر کے اپنے دعوے کا ثبوت دینے کے بجائے ان سے دور بھاگ رہے ہیں اور انھی کو الٹا اپنے ادائے فرض کو ترک کرنے کے جواز میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ انگریزی فوج کا کوئی سپاہی میدان جنگ کا رخ کرنے سے اس لیے انکار کر دے کہ وہاں سے بندوقوں اور توپوں کے چھوٹنے کی دہشت ناک آوازیں آ رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود وکٹوریہ کراس کا اولین مستحق اپنے ہی کو یقین کرتا ہو، حالانکہ یہ معرکہ ہی وہ آزمائش گاہ ہے جو اس تمغۂ شجاعت کا استحقاق عطا کرتی ہے۔

مفاد ملی کا بت اس سلسلہ میں ہمارے لیے سب سے زیادہ حیران کن جو شے ہے وہ "مفاد ملت" کے نقصانات کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس مسلمان کو

كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (نساء - ۲۰)

قسط پر (ہر حال میں) مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے (حق کی) شہادت دینے والے بنو، اگرچہ اس قسط پر قائم رہنے اور اس شہادت (حق) کی زد خود تمھارے ہی اوپر یا تمھارے والدین یا اقربا ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو۔

کی تعلیم دی گئی تھی اور جس کے متعلق یہ طے کر دیا گیا ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ - ۱۴)

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔

اب اس کو اس امر کی تلقین کی جا رہی ہے کہ تو حق اور عدل و قسط کی راہ چھوڑ دے اگر اس کے اختیار کرنے میں تیری قوم کا نقصان ہوتا ہو اور خدا کی رضا جوئی کو دور پھینک دے اگر اس سے تیری جان و مال پر آنچ آتی ہو! آخر مفاد ملت کے نام پر اقامت دین کے فرض سے ہاتھ اٹھانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ اب مسلمان کی نگاہ میں مرکزی اہمیت دین اور قیام دین کو نہیں بلکہ اس کے اپنے معاشی و سیاسی مفاد کو حاصل ہو گئی ہے، اب وہ کوئی ایسا طریق کار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں اختیار کر سکتا جس میں کلمۂ حق کی سربلندی اور مطالبات دین کی بجا آوری تو ہو مگر اپنے یا اپنی "قوم" کے مفاد خطرے میں پڑتے ہوں، اس کو چاہیے کہ دین کو دنیا پر، آجلہ کو عاجلہ پر، معاد کو معاش پر، رضائے الٰہی کو مفاد قومی پر، شہادت حق کو مقاصد سیاسی پر، اقامت دین کو مصالح ملی پر یعنی مقصد زندگی کو زندگی پر قربان کر دے۔ العیاذ باللہ، یہ ذہنیت ہے آج ہم مسلمانوں کی اور یہ انداز فکر ہے پیروان قرآن کا جس پر کفر اور مادیت بھی عش عش کر رہے ہیں۔ ہم اس نظریہ کے واضعین اور حاملین سے اس کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے" (حضرت مسیح)

اس نظریہ کے ساتھ خدا پرستی کا جوڑ کبھی نہیں لگ سکتا۔ جس مفاد قومی کا آپ شور مچا رہے ہیں۔ وہ ایک خطرناک بت ہے جس کو توڑے بغیر اسلام کا مفاد پورا نہیں کیا جا سکتا۔

زمانۂ نبوت میں منافقین کا نقطۂ نظر یہ تھا اور ان کے نفاق کی بنا اس چیز پر تھی کہ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآىِٕرَةٌ ہم کو ڈر ہے کہ اگر ہم کھلم کھلا اور یکسو ہو کر اسلامی جماعت میں شامل ہو گئے تو ہم کو مصیبتیں گھیر لیں گی اور اسلام کی وجہ سے ہم سارے جہان کی عداوت کا نشانہ بنیں گے۔ اسی طرح بہت سے کافروں کا بھی کہنا یہ تھا کہ محمد! تمہاری باتوں کی صحت و صداقت کا ہم انکار نہیں کرتے مگر۔

اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا اگر ہم آپ کے ساتھ ہو کر ہدایت الٰہی کی پیروی کر لیں تو فوراً اپنی مادر وطن سے مار کر نکال باہر کر دیے جائیں گے۔ (قصص - ۶)

یہ دونوں گروہ اتباع حق کے بارے میں جس طرز فکر و استدلال سے کام لے رہے تھے کیا وہی طرز فکر و استدلال آج بھی مفاد قومی کے نعروں کے پیچھے کام نہیں کر رہا ہے؟ قرآن سراپا حق ہے، پیغمبر صادق و مصدق ہے، اتباع اسلام ہی ذریعہ نجاح و فلاح ہے، لیکن اگر قرآن کے مطالبے، رسول کے فرمان اور اسلام کے اصول و مقتضیات پر عمل ہوا تو ہم برباد ہو جائیں گے، ہم کو اندیشہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ زمانہ بھر کی آفات و بلیات ہم پر ٹوٹ پڑیں گی، ذرہ ذرہ ہماری مخالفت پر کمر باندھ لے گا، اپنی "مادر وطن" کو انگریز ہی کے قبضہ میں رہنے دینگے یا برادران وطن کے اقتدار میں دے دیں گے اور ہم خود غلام اور اچھوت، مفلس و پسماندہ اور خدا جانے کیا کیا ہو جائیں گے! کاش مسلمان اپنے خلاف اللہ تعالیٰ کو ایسی کھلی ہوئی حجتیں دینے سے قبل ذرا سوچ لیتے کہ ہم اپنی زبانوں سے کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ تو مفاد قومی کا بچانا نہیں ہے بلکہ اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

پھیر کے راستے

اب رہا یہ سوال کہ آیا ہم اس نصب العین کے لیے براہ راست جد و جہد کرنے کے بجائے کوئی پھیر کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ سو اس کے متعلق تجربہ اور عقل دونوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ طرز عمل سراسر غلط اور ناکام ہے۔ اور حق کی فطرت بھی اس سے ابا کرتی ہے۔ اب تک کی تاریخ یہی بتلاتی ہے کہ جن لوگوں نے بھی اس مقصد کو اپنا مقصد زندگی قرار دیا ہے ان میں سے کسی نے بھی یہ پالیسی اختیار نہیں کی۔ متمدن یا غیر متمدن، آزاد یا غلام، دولت مند یا مفلس غرض جس قسم کی قوم کے اندر بھی کوئی داعی حق اور علمبردار قیام دین آیا اس نے سب سے پہلی آواز جو منہ سے نکالی وہ یہی اور صرف یہی تھی کہ "اے بندگان خدا! خدا کی بندگی اور طاغوت سے اجتناب اختیار کرو" ہم تفحص کے باوجود کسی نبی کو اس پالیسی سے ہٹ کر کوئی دوسری پھیر والی پالیسی اختیار کرتے ہوئے نہیں پاتے۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ ابھی اس سوال کو چھوڑ دیجیے، پہلے اس حقیقت کو پوری جستجو اور تنقید کے ساتھ پرکھ لیجیے کہ ایسا ہی ہوا یا نہیں؟ اگر ایسا ہوا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور یقیناً ہوا، تو پھر ان لوگوں کے لیے جو اسوۂ انبیاء ہی کو اپنا مرجع کل ماننے کے مدعی ہیں، اس طریق کار کو ترک کرنا جائز کسی حجت شرعی کی بنا پر ہو سکتا ہے؟ اگر حالات زمانہ کے اختلافات کوئی چیز ہیں تو کیا اس بات کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ تمام انبیاء کے زمانہائے بعثت تو بالکل یکساں نوعیت کے تھے، جس کی وجہ سے ان سب کے طرز عمل میں انتہائی کامل یکسانی اور مماثلت پائی جاتی ہے، اور یہی بیسویں صدی کا ایک ایسا انوکھا اور غیر معمولی زمانہ ہے جس کے حالات یکایک اب تک کی پوری تاریخ انسانی کے حالات سے بالکل مختلف ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا دعویٰ کوئی بھی عاقل نہیں کر سکتا اور سب جانتے ہیں کہ کچھ غیر متغیر حقائق تو ایسے ہیں جو تمام زمانوں میں مشترک رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے مگر عوارض و ظواہر اور احوال و ظروف ہر دور کے الگ الگ ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ اس لیے اگر ان ظاہری خصوصیات کا لحاظ کیا جائے تو جس طرح آج کا زمانہ پہلی صدی ہجری سے مختلف ہے۔ اسی طرح پہلی صدی ہجری کا زمانہ دور عیسوی سے اور دور عیسوی دور موسوی سے بھی مختلف تھا، اس لیے اگر اختلاف احوال کے باوجود تمام انبیاء نے متفقہ طور پر ہمیشہ براہ راست جدوجہد کی پالیسی اختیار کی تو اس اختلاف کے باوجود بھی، جو ہمارے زمانہ اور پچھلے زمانوں میں بظاہر نظر آتا ہے، ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ یہی پالیسی اختیار کریں۔ کیونکہ اس کام کے لیے کوئی دوسرا طریقہ کبھی آزمایا ہی نہیں گیا۔ اور تمام انبیاء کا اسی طریق کار کو اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس جدوجہد کا مزاج ہی اسی قسم کا ہے کہ اس کے لیے براہ راست اقدام کیا جائے۔ یہ دلیل یقین سے بڑھ کر ہم کو حق الیقین اور عین الیقین کی حد تک پہنچا دے سکتی ہے اگر ہم اس چیز کو سامنے رکھ لیں کہ بعض انبیاء کو پھیری پالیسی اختیار کرنے کے بہتر سے بہتر مواقع ہاتھ آئے مگر انھوں نے پوری صفائی کے ساتھ ان کو ٹھکرا دیا۔ سید الانبیاء صلعم کے سامنے قریش نے پیش کش کی کہ آپ کو ہم اپنا بادشاہ بنائے لیتے ہیں اور اس کے لیے ہم آپ سے یہ مطالبہ بھی نہیں کرتے کہ آپ اپنی "دعوت توحید" سے دست کش ہو جائیں، آپ سے ہماری صرف اتنی گزارش ہے کہ آپ ہمارے بتوں کو برا کہنے اور ہمارے جذبات کو ٹھیس لگانے سے باز رہیں۔ غور فرمائیے کہ آج کے اہل سیاست و تدبر کے نقطۂ نظر سے یہ کتنا اچھا اور مغتنم موقع تھا کہ رسول اللہ اس پیشکش کو قبول فرما کر ایک طرف تو ان مصیبتوں اور فتنوں کا خاتمہ کر لیتے جو ان کی اور ان کے پیرووں کی زندگی اجیرن کیے ہوئے تھے، دوسری طرف تخت حجاز پر قابض ہو کر حکمت و تدبر اور مصلحت شناسی کے ساتھ اپنے حاکمانہ اثر و اقتدار سے کام لیتے ہوئے تدریجاً اپنی منزل مقصود کی طرف مارچ کرتے اور رفتہ رفتہ دین حق کو مملکت حجاز و عرب پر قائم کر دیتے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ پیغمبر عالم نے اس "مغتنم" موقع پر کیا طرز عمل اختیار کیا اور اس پیش کش کا کیا جواب دیا؟ یہ کہ "خدا کی قسم اگر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیے جائیں تو بھی میں اپنی دعوت حق اور اپنے طریق کار سے باز نہ آؤں گا"۔ یہ کسی پرجوش اور ماؤف الدماغ انقلابی نوجوان کے الفاظ نہ تھے بلکہ اس معلم حکمت اور راز دان حقیقت کے الفاظ تھے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ اس کے دل اور زبان پر براہ راست خدا کی نگرانی قائم تھی اور جس نے کبھی کوئی بات جذبات کے ہیجان میں نہیں کہی۔ اس لیے ایک مومن کا ذہن تو اس وہم کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دے گا کہ آنحضرتؐ نے اس موقع اور اس طریق کار کے ہاتھ آتے ہوئے بھی عمداً ان کو ترک کر دیا جو حصول مقصد کے لیے براہ راست جدوجہد سے زیادہ موزوں اور کارگر تھے۔ یا یہ کہ ان میں، نعوذ باللہ دور حاضر کے مدبرول اتنی بھی انجام بینی نہ تھی اور نہ یہ صلاحیت تھی کہ "احوال و ظروف زمانہ" کے مطالبات و مقتضیات کا اندازہ کر سکتے اور وقت و ماحول کی مصلحت سے اس پالیسی کو قبول کر لیتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انبیائے کرام کے اس اسوے اور متفقہ طریق کار کے ہوتے ہوئے ہم کو کس اسوہ اور راہ عمل کی ضرورت ہے۔ نظری حیثیت سے بھی دیکھیے تو اس طرز فکر اور اس نظریہ میں بے بنیاد وہموں اور طفلانہ خوش گمانیوں اور خود فریبیوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ پھیر کے راستے اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حق کو باطل نما بنا کر پیش کیا جائے اور جس باطل میں آپ پڑے ہوئے ہیں اس سے نکل کر حق کی طرف بھاگنے کے بجائے ایک دوسرے باطل کے سایہ میں جا کھڑے ہوں کیونکہ اگر آپ موجودہ باطل ماحول کو درہم کر کے ایک ایسا ماحول قائم کریں جو حق نہ ہو تو لازماً باطل ہی ہوگا۔ جس کا رنگ و روغن تو نیا ہوگا مگر فطرت بہرحال وہی ہوگی جو موجودہ باطل کی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم اس پر اثر ڈال کر اپنے نصب العین کے لیے زیادہ سازگار بنائیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ دنیائے عمل میں اس خام خیالی کی کوئی قیمت نہیں، باطل کبھی حق کا سازگار نہیں ہو سکتا۔ اور اس میں حق کے جو پیوند آپ بہزار دقت لگائیں گے وہ اُس کے مقصد کے لیے خالص باطل اجزاء سے زیادہ ہی مضر ثابت ہوں گے۔ دور نہ جائیے اسی ہندوستان میں بہت سی "اسلامی ریاستیں" قائم ہیں جن میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جن کا آپ آئندہ نظام ملکی میں جوڑ لگانا چاہتے ہیں، مگر وہاں اقامت دین کا نام ہی لے کر دیکھیے، جیل کا دروازہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائیں گے۔ آپ اپنی اس جدوجہد میں غیر ملکی حکومت ہی کو سدراہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے اس کے ہٹ جانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر آپ شاید بھول لیتے ہیں کہ حضرت مسیح کے مشن کے متعلق رومی اقتدار ابھی خاموش ہی تھا کہ ان کی اپنی ہی قوم یا یوں کہیے کہ اس وقت کے "مسلمانوں" ہی نے بڑھ کر اس مشن کا گلا گھونٹ دیا۔ پھر اپنی حال ہی کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ شیخ عبدالوہاب نجدی کی تحریک کا متعلقہ "اسلامی" حکومتوں نے کس تپاک سے استقبال کیا، شیخ جمال الدین افغانی نے ایک جزئی دینی تحریک کا نام لیا اور آپ کی انہی موجودہ اسلامی حکومتوں نے انکو رہنے کے لیے جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ اور اگر آج بھی کسی کو ہمت ہو تو ان ممالک میں جا کے یہ آواز اٹھا کر قدر عافیت معلوم کر سکتا ہے۔

درحقیقت یہ دفع الوقتی کی باتیں ہیں اور یہ نظریہ اسی ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے قرآن کے احکام و مطالبات کی "ناسازگاری" سے گھبرا کر مطالبہ کیا تھا کہ "اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اسی میں کچھ ایسی ترمیمیں کر دیجیے جو زمانہ اور ماحول سے ہم آہنگی پیدا کر سکیں"۔ اس طرز پر سوچنے والوں کی نگاہ شاید اس طرف نہیں جاتی کہ دنیا کے جو ہنگامے آج ہیں، کل بھی رہیں گے اور جو مصالح اور مشکلات آج ان کا راستہ روک رہی ہیں، آئندہ بھی ان میں کوئی کمی رونما نہ ہوگی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ پیچ کی راہ اختیار کرنے کے اسباب و محرکات نہ کبھی ختم ہوں اور نہ اقامت دین کے لیے کبھی براہ راست جدوجہد کی جائے۔

(باقی آئندہ)

© rasailojaraid.com